ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

AIOU LIBRARY aioulibrary.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 407

Program:

Semester: Autumn 2026

WhatsApp Orders: +92 324 5836626

ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY, ISLAMABAD

Course: جدید تاریخ اسلام (407) • Level: B.A.

Semester: Autumn 2026

Assignment No. 1 (Units 1–4)

Total Marks: 100 • Passing Marks: 40

SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

(For Study & Reference)

Note: This guide is prepared for study and reference purposes. Students are advised to read the relevant units of the course book, understand the concepts, and then write the assignment in their own words. Copying this guide word for word is not recommended.

نوٹ: یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور رہنمائی کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ سے گزارش ہے کہ متعلقہ یونٹوں کا مطالعہ کر کے جوابات اپنے الفاظ میں تحریر کریں۔

AIOU LIBRARY aioulibrary.com

سوال نمبر 1: درج ذیل سوالات کے مختصر جواب تحریر کریں (20 نمبر)

تعارف

جدید تاریخ اسلام کا آغاز سلطنت عثمانیہ کے عروج سے ہوتا ہے، جو سولہویں اور سترہویں صدی میں دنیا کی عظیم ترین طاقتوں میں شمار ہوتی تھی۔ اس کے بعد یورپی طاقتوں کی پیش قدمی، قومی ریاستوں کے ظہور اور استعمار کی یلغار نے مسلم دنیا کا نقشہ بدل دیا۔ درج ذیل مختصر سوالات انہی بنیادی تاریخی حقائق سے متعلق ہیں جن پر اس کورس کے پہلے چار یونٹوں کی عمارت کھڑی ہے۔ ہر سوال کا جواب درست تاریخ، پس منظر اور اہمیت کے ساتھ دیا گیا ہے تاکہ طالب علم کو واقعات کی ترتیب اور ان کے باہمی ربط کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

جدول 1: اہم واقعات کی زمانی ترتیب

اہمیت	واقعہ	سال
سات سالہ جنگ میں پروشیا کی ساکھ کو دھچکا	آسٹریا کا برلن پر عارضی قبضہ	1757ء
وسط ایشیا میں روسی توسیع کی بنیاد	قازقستان کی روس سے اطاعت کا آغاز	1731ء
جدید ترکی کی خود مختاری کی بین الاقوامی منظوری	معاہدہ لوزان	1923ء

WhatsApp Orders: +92 324 5836626

البانیہ میں بادشاہت کا قیام	احمد زوگو کا اعلان بادشاہت	1928ء
عرب اسرائیل جنگ کے بعد کی سیاست	ناصر کا استعفیٰ اور واپسی	1967ء
مصر اسرائیل امن عمل کا آغاز	سادات کا دورۂ یروشلم	1977ء

1۔ سترہویں صدی تک سلطنت عثمانیہ کتنے براعظموں تک پھیلی ہوئی تھی؟

سترہویں صدی تک سلطنت عثمانیہ تین براعظموں — ایشیا، یورپ اور افریقہ — تک پھیلی ہوئی تھی۔ ایشیا میں اناطولیہ، شام، عراق، حجاز، یمن اور جزیرہ نما عرب کے بڑے حصے اس کے زیر نگیں تھے؛ یورپ میں بلقان، یونان، بلغاریہ، سربیا، رومانیہ اور ہنگری کا بڑا حصہ شامل تھا، اور افریقہ میں مصر، لیبیا، تیونس اور الجزائر اس کی عملداری میں تھے۔ سلیمان عالیشان کے دور میں سلطنت اپنے عروج پر پہنچی اور قسطنطنیہ تین براعظموں پر پھیلی اس عظیم سلطنت کا دارالحکومت تھا۔ یہی جغرافیائی وسعت عثمانیوں کو عالمی سیاست کا مرکز بناتی تھی۔

2۔ آسٹریا نے برلن پر کب قبضہ کیا؟

آسٹریا نے برلن پر اکتوبر 1757ء میں قبضہ کیا۔ یہ واقعہ سات سالہ جنگ کے دوران پیش آیا جب آسٹریا کے جرنیل آندرئاس ہاڈک نے اپنے تیز رفتار سوار دستے کے ساتھ اچانک حملہ کر کے پروشیا کے دارالحکومت برلن میں داخلہ کیا۔ پروشیا کا بادشاہ فریڈرک اعظم اس وقت اپنی فوج کے ساتھ دوسرے محاذ پر مصروف تھا۔ ہاڈک نے شہر سے بھاری تاوان وصول کیا اور پروشیائی فوج کی آمد سے پہلے بحفاظت واپس لوٹ گیا۔ یہ قبضہ اگرچہ عارضی اور صرف ایک دن کا تھا، مگر اس نے یورپ بھر میں پروشیا کی ساکھ کو شدید دھچکا پہنچایا اور آسٹریا کی فوجی صلاحیت کا لوہا منوایا۔

3۔ قازقستان نے روس کی اطاعت کب کی؟

قازقستان نے روس کی اطاعت اٹھارہویں صدی کے اوائل میں، خصوصاً 1731ء میں، قبول کی۔ قازق خانات تین بڑے گروہوں میں منقسم تھا جنہیں جوز کہا جاتا تھا۔ چھوٹے جوز کے خان ابوالخیر نے 1731ء میں روس کی ملکہ اینا سے اطاعت کا حلف اٹھایا تاکہ جنگجو قبائل خصوصاً زونگاروں کے حملوں سے تحفظ حاصل ہو سکے۔ اس کے بعد بتدریج

درمیانے اور بڑے جوز بھی روسی اثر ورسوخ میں آتے گئے۔ یہ اطاعت ابتدا میں محض حفاظتی اتحاد تھی، مگر وقت گزرنے کے ساتھ روس نے قلعے، چھاؤنیاں اور انتظامی نظام قائم کر کے وسط ایشیا کی طرف اپنی توسیع کی بنیاد رکھ دی، جس کے نتیجے میں انیسویں صدی میں پورا خطہ روسی سلطنت کا حصہ بن گیا۔

4۔ احمد بیگ زوگو نے بادشاہت کا اعلان کب کیا؟

احمد بیگ زوگو نے یکم ستمبر 1928ء کو البانیہ میں بادشاہت کا اعلان کیا۔ احمد زوگو سلطنت عثمانیہ کے زوال کے بعد آزاد ہونے والے مسلم اکثریتی ملک البانیہ کے اہم سیاسی رہنما تھے۔ وہ پہلے وزیر اعظم اور پھر 1925ء میں صدر جمہوریہ بنے۔ 1928ء میں آئین ساز اسمبلی نے البانیہ کو بادشاہت قرار دیا اور احمد زوگو "زوگ اول" کے لقب سے تخت نشین ہوئے۔ انہوں نے انتظامی، عدالتی اور معاشی اصلاحات نافذ کیں اور ملک کو جدید خطوط پر استوار کرنے کی کوشش کی، تاہم ان کا اقتدار 1939ء میں اٹلی کے قبضے کے ساتھ ختم ہو گیا۔

5۔ ترکی نے معاہدہ لوزان پر کب دستخط کئے؟

ترکی نے معاہدہ لوزان پر 24 جولائی 1923ء کو دستخط کئے۔ یہ معاہدہ سوئٹزرلینڈ کے شہر لوزان میں طے پایا اور اس نے پہلی جنگ عظیم کے بعد ترکی پر مسلط کردہ ذلت آمیز معاہدہ سیورے کو منسوخ کر دیا۔ مصطفیٰ کمال کی قیادت میں ترک افواج نے یونانی فوج کو اناطولیہ سے نکال باہر کیا تھا، جس کے بعد اتحادی طاقتوں کو نئے سرے سے مذاکرات پر مجبور ہونا پڑا۔ معاہدہ لوزان نے جدید جمہوریہ ترکی کی بین الاقوامی سرحدوں کو تسلیم کیا، غیر ملکی مراعات کا خاتمہ کیا اور ترکی کی مکمل خود مختاری بحال کر دی۔ اسی لیے اسے ترک قوم کی سفارتی فتح قرار دیا جاتا ہے۔

6۔ شاہ حسن ثانی کب حکمران بنے؟

شاہ حسن ثانی 1961ء میں مراکش کے حکمران بنے۔ ان کے والد شاہ محمد پنجم، جنہوں نے فرانسیسی استعمار سے آزادی کی جدوجہد کی قیادت کی تھی، 26 فروری 1961ء کو انتقال کر گئے۔ ان کے بعد ولی عہد حسن ثانی تخت نشین ہوئے اور 3 مارچ 1961ء کو باقاعدہ ان کی تاج پوشی ہوئی۔ حسن ثانی نے اڑتیس برس تک حکومت کی اور اس عرصے میں

مراکش نے آئینی، سیاسی اور سفارتی میدانوں میں کئی نشیب و فراز دیکھے۔ ان کے دور کی نمایاں خصوصیات میں بادشاہت کا استحکام، مغربی صحارا کا مسئلہ اور سبز مارچ شامل ہیں، جن کا تفصیلی جائزہ سوال نمبر 4 میں پیش کیا گیا ہے۔

7۔ بعث پارٹی کے لیڈر مصر میں کب برسر اقتدار آئے؟

اس سوال کے جواب میں تاریخی حقیقت کی وضاحت ضروری ہے کہ بعث پارٹی مصر میں کبھی برسر اقتدار نہیں آئی۔ بعث پارٹی عرب سوشلسٹ نظریات کی حامل جماعت تھی جو شام اور عراق میں منظم ہوئی۔ شام میں بعث پارٹی 8 مارچ 1963ء کے فوجی انقلاب کے ذریعے اقتدار میں آئی، جبکہ عراق میں بعث پارٹی پہلے 1963ء میں مختصر مدت کے لیے اور پھر 17 جولائی 1968ء کو باقاعدہ برسر اقتدار آئی، جہاں بعد میں صدام حسین اس کے سربراہ بنے۔ مصر میں اس زمانے میں جمال عبدالناصر کی عرب سوشلسٹ یونین حکمران جماعت تھی۔ مصر اور شام 1958ء سے 1961ء تک متحدہ عرب جمہوریہ کی صورت میں متحد بھی رہے، مگر ناصر اور بعثی قیادت کے اختلافات نے یہ اتحاد ختم کر دیا۔ یوں درست جواب یہی ہے کہ بعثی اقتدار کا مرکز شام اور عراق رہے، مصر نہیں۔

8۔ مصر کے صدر ناصر کب مستعفی ہوئے؟

مصر کے صدر جمال عبدالناصر نے 9 جون 1967ء کو استعفیٰ دیا۔ جون 1967ء کی عرب اسرائیل جنگ میں مصر، شام اور اردن کو اسرائیل کے ہاتھوں ذلت آمیز شکست ہوئی؛ مصر کی فضائیہ چند گھنٹوں میں تباہ ہو گئی اور صحرائے سینا پر اسرائیل قابض ہو گیا۔ اس شکست کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے ناصر نے ریڈیو پر قوم سے خطاب میں استعفیٰ کا اعلان کیا۔ تاہم مصری عوام نے لاکھوں کی تعداد میں سڑکوں پر نکل کر ان سے استعفیٰ واپس لینے کا مطالبہ کیا، جس پر اگلے ہی دن، 10 جون 1967ء کو، انہوں نے اپنا استعفیٰ واپس لے لیا اور 1970ء میں وفات تک صدر رہے۔ یہ واقعہ عرب دنیا میں ناصر کی غیر معمولی عوامی مقبولیت کا ثبوت تھا۔

9۔ اخوان المسلمون کو سیاسی جماعت کی حیثیت سے کام کرنے کی اجازت کب ملی؟

اخوان المسلمون کو سیاسی جماعت کی حیثیت سے کام کرنے کی باضابطہ اجازت 2011ء میں ملی۔ اخوان کی بنیاد حسن البنا نے 1928ء میں رکھی تھی، مگر مختلف ادوار میں اس پر پابندیاں عائد رہیں اور یہ باقاعدہ سیاسی جماعت کے طور پر رجسٹرڈ نہ ہو سکی۔ 2011ء میں صدر حسنی مبارک کی حکومت کے خاتمے کے بعد پیدا ہونے والی سیاسی گنجائش میں

AIOU LIBRARY aioulibrary.com

اخوان نے اپنی سیاسی شاخ "حزب الحریہ والعدالہ" یعنی فریڈم اینڈ جسٹس پارٹی قائم کی، جسے جون 2011ء میں سرکاری طور پر تسلیم کیا گیا۔ اسی جماعت کے امیدوار محمد مرسی 2012ء میں مصر کے صدر منتخب ہوئے۔ یوں تقریباً آٹھ دہائیوں کی زیرِ زمین اور نیم قانونی جدوجہد کے بعد اخوان کو کھلے عام سیاسی جماعت کے طور پر کام کرنے کا موقع ملا۔

10۔ مصر کے صدر سادات نے اسرائیل کا دورہ کب کیا؟

مصر کے صدر انور سادات نے اسرائیل کا دورہ نومبر 1977ء میں کیا۔ وہ 19 نومبر 1977ء کو یروشلم پہنچے اور 20 نومبر کو اسرائیلی پارلیمنٹ کنیسٹ سے تاریخی خطاب کیا۔ یہ کسی بھی عرب سربراہ کا اسرائیل کا پہلا سرکاری دورہ تھا، جس نے پوری دنیا کو حیران کر دیا۔ سادات کا مقصد 1973ء کی جنگ کے بعد جمود کا شکار امن عمل کو آگے بڑھانا اور صحرائے سینا کی واپسی کا راستہ ہموار کرنا تھا۔ اس دورے کی بنیاد پر 1978ء میں کیمپ ڈیوڈ معاہدے اور 1979ء میں مصر اسرائیل امن معاہدہ طے پایا، جس کے نتیجے میں سینا مصر کو واپس مل گیا، مگر مصر کو عرب لیگ سے عارضی اخراج اور عرب دنیا کی شدید تنقید کا سامنا بھی کرنا پڑا۔

نتیجہ

خلاصہ یہ کہ یہ مختصر سوالات جدید مسلم تاریخ کے اہم موڑ بیان کرتے ہیں: عثمانی سلطنت کی تین براعظموں پر پھیلی وسعت سے لے کر معاہدہ لوزان کے ذریعے ترکی کی خود مختاری کی بحالی تک، اور ناصر و سادات کے ادوار تک، ہر واقعہ نے مشرقِ وسطیٰ اور مسلم دنیا کی سیاست کو نئی سمت دی۔ ان تاریخوں اور حقائق کو ذہن نشین رکھنا آگے کے تفصیلی سوالات کو سمجھنے کے لیے ناگزیر ہے۔

سوال نمبر 2: ترکی کو آزادی دلانے میں مصطفیٰ کمال کے کردار کا تنقیدی جائزہ لیں (20 نمبر)

تعارف

پہلی جنگ عظیم میں شکست کے بعد سلطنت عثمانیہ موت کے دہانے پر تھی۔ 1920ء کے معاہدہ سیورے نے اناطولیہ کو بھی اتحادیوں اور یونان کے درمیان بانٹ دیا تھا۔ ایسے نازک وقت میں مصطفیٰ کمال نے ترک قوم کو از سرِ نو منظم کر کے جنگ آزادی جیتی اور جدید جمہوریہ ترکی کی بنیاد رکھی۔ اس سوال میں ہم مصطفیٰ کمال کے کردار کا تنقیدی جائزہ لیں گے: ان کی عسکری و سیاسی کامیابیاں بھی اور ان اصلاحات پر ہونے والی تنقید بھی۔

مصطفیٰ کمال 1881ء میں سالونیکا میں پیدا ہوئے، فوجی تعلیم حاصل کی اور پہلی جنگ عظیم میں گیلی پولی کے محاذ پر شاندار کامیابی سے قومی ہیرو بنے۔ یہی پس منظر انہیں جنگ آزادی کی قیادت کا اہل بناتا تھا۔

جدول 2: مصطفیٰ کمال کے کردار کے اہم مراحل

سال	مرحلہ	نتیجہ
1915ء	گیلی پولی کا دفاع	قومی ہیرو کے طور پر شہرت
1919ء	سمسون آمد اور قومی مزاحمت کا آغاز	جنگ آزادی کی بنیاد
1921ء	جنگ سقاریہ	یونانی پیش قدمی رک گئی
1922ء	عظیم جارحیت اور آزادی ازمیر	اناطولیہ دشمن سے پاک
1923ء	معاہدہ لوزان اور اعلان جمہوریہ	خود مختار جدید ترکی
1924ء	خلافت کا خاتمہ	سیکولر ریاست کی طرف فیصلہ کن قدم

AIOU LIBRARY aioulibrary.com

جنگ آزادی کی عسکری قیادت

مئی 1919ء میں مصطفیٰ کمال سمسون پہنچے اور قسطنطنیہ کی کٹھ پتلی حکومت سے قطع تعلق کر کے قومی مزاحمت کی بنیاد رکھی۔ اماسیا اعلامیے، ارزروم اور سیواس کانگریسوں کے ذریعے انہوں نے "قومی عہد" منظور کرایا جس میں ترک وطن کی ناقابل تقسیم وحدت کا اعلان کیا گیا۔ اپریل 1920ء میں انقرہ میں عظیم قومی اسمبلی قائم ہوئی جس نے متوازی حکومت کی حیثیت اختیار کر لی۔

میدان جنگ میں ان کی فیصلہ کن کامیابیاں قابل ذکر ہیں۔ سقاریہ کی جنگ (1921ء) میں یونانی پیش قدمی روکی گئی، جس پر اسمبلی نے انہیں "غازی" کا خطاب اور فیلڈ مارشل کا عہدہ دیا۔ اگست 1922ء کی عظیم جارحیت میں یونانی فوج کو پسپا کر کے ازمیر آزاد کرایا گیا۔ یوں تین برس میں وہ وطن جسے مردہ سمجھا جا رہا تھا، دشمنوں سے پاک ہو گیا۔

سفارتی کامیابیاں اور معاہدہ لوزان

مصطفیٰ کمال صرف جنگجو نہیں، ماہر مدبر بھی تھے۔ انہوں نے اتحادیوں کے اختلافات سے فائدہ اٹھایا: سوویت روس سے 1921ء میں ماسکو معاہدہ کر کے مشرقی سرحد محفوظ کی، فرانس سے انقرہ معاہدہ کر کے جنوبی محاذ ختم کیا، اور اٹلی کو غیر جانبدار رکھا۔ اس طرح پوری قوت یونان کے خلاف مرکوز ہو سکی۔

جنگ بندی مدانیا (اکتوبر 1922ء) کے بعد لوزان کانفرنس میں ترک موقف کی فتح ہوئی۔ 24 جولائی 1923ء کا معاہدہ لوزان معاہدہ سیورے کی تدفین تھا: قسطنطنیہ اور مشرقی تھریس واپس ملے، غیر ملکی مراعات ختم ہوئیں اور ترکی مکمل خود مختار ریاست تسلیم کیا گیا۔ یہ سفارتی کامیابی عسکری فتح کا منطقی نتیجہ تھی اور اس میں قیادت کی دور اندیشی کا بڑا دخل تھا۔

جمہوریہ کا قیام اور اصلاحات

29 اکتوبر 1923ء کو جمہوریہ ترکی کا اعلان ہوا اور مصطفیٰ کمال اس کے پہلے صدر بنے۔ مارچ 1924ء میں خلافت کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اس کے بعد تیزی سے اصلاحات ہوئیں: سوئٹزرلینڈ کی طرز کا دیوانی قانون، لاطینی رسم الخط کی ترویج (1928ء)، خواتین کو ووٹ اور سیاسی حقوق، تعلیم کی یکسانیت، لادینی آئین اور لقب "اتاترک" یعنی ترکوں کا باپ۔

ان اصلاحات کا مقصد ترکی کو مغرب کی صف میں کھڑا کرنا تھا۔ یقیناً شرح خواندگی بڑھی، معیشت منظم ہوئی اور ریاست مؤثر بنی، مگر انقلابی رفتار نے معاشرے کے دینی و ثقافتی طبقوں کو ریاست سے دور بھی کر دیا۔

تنقیدی جائزہ

تنقیدی نقطہ نظر سے مصطفیٰ کمال کے کردار کے دو رخ ہیں۔ مثبت رخ یہ ہے کہ انہوں نے ناممکن نظر آنے والی صورتحال میں قوم کو متحد کیا، وطن آزاد کرایا اور ریاست کو جدید ادارے دیے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے شکست خوردہ سلطنت کی جگہ ایک قابل عمل قومی ریاست تعمیر کی جو آج تک قائم ہے۔

منفی رخ میں خلافت کا اچانک خاتمہ شامل ہے جس نے عالم اسلام میں گہرے صدمے کی کیفیت پیدا کی؛ ہندوستان کی تحریک خلافت کے رہنماؤں کو بھی مایوسی ہوئی۔ یک جماعتی نظام، مخالفین کا دباؤ، کرد مسئلے سے سختی سے نمٹنا اور مذہبی طبقات پر پابندیاں ان کی آمرانہ روش کو ظاہر کرتی ہیں۔ لاطینی رسم الخط نے نئی نسل کو عثمانی علمی ورثے سے کاٹ دیا۔ مؤرخین کا خلاصہ یہ ہے کہ آزادی دلانا ان کا عظیم کارنامہ تھا، مگر انقلابی سیکولر ایجنڈا ترک معاشرے میں دیرپا ثقافتی کشمکش کا باعث بنا۔

مصطفیٰ کمال کی شخصیت کا مجموعی اندازہ

مصطفیٰ کمال کی شخصیت کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کی کامیابیوں کا راز صرف عسکری ذہانت نہیں تھی بلکہ وقت کی نبض پر ہاتھ رکھنا بھی تھا۔ انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ عثمانی خلافت کا پرانا ڈھانچہ عالمی سیاست میں مزید چل نہیں سکتا اور ترک قوم کی بقا قومی ریاست ہی میں ہے۔ اسی فہم نے انہیں ہم عصروں سے آگے رکھا۔ وہ عوام کو متحرک کرنا جانتے تھے: سقاریہ کی جنگ سے پہلے اسمبلی سے مکمل اختیارات لے کر انہوں نے فیصلے کی رفتار تیز کی، اور فتح کے بعد یہ اختیارات واپس کر کے پارلیمانی وقار بھی بحال رکھا۔

دوسری طرف ان کی ذات پر ہونے والی تنقید کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انہوں نے ترک معاشرے کو اس کی اسلامی شناخت سے تیزی سے الگ کرنے کی کوشش کی، جس کے سماجی ردعمل کئی دہائیوں تک محسوس کیے گئے۔ ٹوپی و لباس کے قوانین، خانقاہوں کی بندش اور عوامی زندگی سے مذہب کا اخراج عام آدمی کے لیے اجنبی تجربہ تھا۔ اس کے باوجود انصاف یہ ہے کہ ان کا بنیادی ہدف ملک کی بقا اور جدید خطوط پر تعمیر تھا، اور اس ہدف میں وہ بڑی حد تک کامیاب رہے۔ ترک تاریخ میں انہیں "غازی مصطفیٰ کمال اتاترک" کے نام سے جو احترام حاصل ہے، وہ اسی دوہرے کردار — نجات دہندہ اور انقلابی مصلح — کا مجموعی اظہار ہے۔ طالب علم کے لیے سبق یہ ہے کہ قیادت کا جائزہ اس کے زمانے کے حالات کی روشنی میں کرنا چاہیے، نہ کہ آج کے معیاروں کو ماضی پر من و عن لاگو کر کے۔

نتیجہ

مجموعی طور پر مصطفیٰ کمال ترکی کے محسن اور جدید ترکی کے معمار تھے۔ جنگ آزادی میں ان کی قیادت نہ ہوتی تو آج کا ترکی وجود میں نہ آتا۔ البتہ ان کی اصلاحات کی رفتار اور مذہب سے متعلق پالیسیوں پر تنقید بھی تاریخی حقیقت ہے۔ متوازن جائزہ یہی ہے کہ انہیں قومی نجات دہندہ کی حیثیت سے یاد رکھا جائے، اور ان کے بعد کے اقدامات کو اسی تناظر میں پرکھا جائے۔

سوال نمبر 3: لیبیا کے شاہ ادریس اور ناصر کے دورِ حکومت کے اہم واقعات کا تنقیدی جائزہ لیں نیز پاکستان کے ساتھ تعلقات کی نوعیت بیان کریں (20 نمبر)

تعارف

لیبیا 1951ء میں شاہ ادریس السنوسی کی قیادت میں آزاد ہوا اور 1969ء تک بادشاہت رہا۔ اسی عرصے میں خطے کی سیاست پر مصر کے جمال عبدالناصر کا گہرا اثر تھا، جن کی عرب قوم پرستی کی لہر نے لیبیا کے نوجوان افسروں کو بھی متاثر کیا۔ اس سوال میں دونوں ادوار کے اہم واقعات، بادشاہت کے خاتمے کی وجوہات اور پاکستان کے ساتھ لیبیا کے تعلقات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

پس منظر یہ ہے کہ لیبیا اٹلی کی نو آبادی تھا؛ دوسری جنگ عظیم کے بعد اقوام متحدہ کی قرارداد کے تحت 24 دسمبر 1951ء کو یہ آزاد ریاست بنا اور صوفی سلسلے السنوسیہ کے سربراہ ادریس بادشاہ بنے۔

شاہ ادریس کے دور کے اہم واقعات

شاہ ادریس کا دور 1951ء سے 1969ء تک محیط ہے۔ ابتدائی برسوں میں لیبیا غربت زدہ ملک تھا اور اس کی آمدنی کا انحصار امریکہ اور برطانیہ سے ملنے والی امداد اور فوجی اڈوں کے کرائے پر تھا؛ وہیلَس امریکی فضائی اڈہ اس کی واضح مثال ہے۔ 1955ء کے بعد تیل کی تلاش شروع ہوئی اور 1959ء میں زلطن کے مقام پر تیل دریافت ہوا، جس سے لیبیا کی تقدیر بدل گئی۔ 1961ء سے تیل کی برآمد شروع ہوئی اور چند ہی برسوں میں لیبیا امیر تیل ممالک میں شامل ہو گیا۔

آئینی سطح پر 1963ء میں وفاقی نظام ختم کر کے وحدانی ریاست قائم کی گئی اور خواتین کو ووٹ کا حق ملا۔ بن غازی اور طرابلس میں تعلیمی ادارے قائم ہوئے۔ مگر ترقی کے ثمرات عوام تک متوازن انداز میں نہیں پہنچے، بدعنوانی اور شاہی خاندان کی مراعات پر نکتہ چینی بڑھتی گئی، جبکہ بادشاہت کی مغرب نواز پالیسی قوم پرست حلقوں میں ناپسندیدہ تھی۔

ناصر کے اثرات اور لیبیا کی سیاست

جمال عبدالناصر 1952ء کے مصری انقلاب کے بعد عرب دنیا کے مقبول ترین رہنما بن چکے تھے۔ 1956ء کی سویز جنگ نے ان کی شہرت کو بام عروج تک پہنچایا۔ لیبیا کے نوجوانوں اور فوجی افسروں میں "صوت العرب" ریڈیو کے ذریعے ناصریت کے نظریات مقبول ہو گئے: عرب اتحاد، استعمار سے مکمل آزادی اور مغربی اڈوں کا خاتمہ ان کے نعرے تھے۔

1967ء کی عرب اسرائیل جنگ میں مصر کی شکست کے باوجود عرب قوم پرستی کی لہر لیبیا میں کم نہ ہوئی، بلکہ شاہی حکومت کی اسرائیل کے خلاف غیر مؤثر پالیسی پر غصہ بڑھا۔ بالآخر یکم ستمبر 1969ء کو کرنل معمر قذافی کی قیادت میں نوجوان افسروں کے ایک گروہ نے بادشاہت کا تختہ الٹ دیا، جبکہ شاہ ادریس علاج کے لیے بیرون ملک تھے۔ اس انقلاب پر ناصری فکر کا واضح اثر تھا اور قذافی نے خود کو ناصر کا جانشین قرار دیا۔

تنقیدی جائزہ

تنقیدی طور پر شاہ ادریس کا دور استحکام کا دور تھا: ملک کو آزادی ملی، ریاستی ادارے بنے اور تیل کی دولت دریافت ہوئی۔ مگر اس دور کی کمزوریاں بھی نمایاں ہیں: معیشت اور خارجہ پالیسی مغربی طاقتوں سے وابستہ رہی، جدید سیاسی جماعتوں اور پارلیمانی روایت کو پنپنے نہیں دیا گیا، اور تیل کی آمدنی کے باوجود سماجی ترقی سست رہی۔ یہی خلا قوم پرست توقعات اور شاہی عمل کے درمیان بڑھتا گیا۔

دوسری جانب ناصر کا کردار دو دھاری تھا۔ انہوں نے عرب عوام کو وقار اور خود اعتمادی دیے اور لیبیا سمیت پورے خطے میں استعمار مخالف سوچ پیدا کی، مگر ان کی مہم جوئی، 1967ء کی شکست اور اتحاد کے ناکام تجربات نے عرب قوم پرستی کی عملی کمزوریاں بھی بے نقاب کر دیں۔ لیبیا میں بادشاہت کا خاتمہ انہی دو عوامل — داخلی ناکافی کارکردگی اور خارجی فکری لہر — کا نتیجہ تھا۔

پاکستان کے ساتھ تعلقات کی نوعیت

پاکستان اور لیبیا کے تعلقات شروع ہی سے مذہبی اخوت اور باہمی احترام پر مبنی رہے۔ پاکستان نے لیبیا کی آزادی کی حمایت کی اور دونوں ممالک اقوام متحدہ اور بعد میں اسلامی کانفرنس تنظیم کے پلیٹ فارم پر ایک دوسرے کے موقف کی تائید کرتے رہے۔ شاہ ادریس کے دور میں تعلقات رسمی اور خوشگوار رہے، تاہم تجارت اور عوامی روابط محدود رہے کیونکہ لیبیا کی توجہ مغرب کی طرف تھی۔

1969ء کے بعد تعلقات میں گرم جوشی بڑھی؛ 1974ء کی لاہور اسلامی سربراہی کانفرنس میں قذافی کی شرکت اور پاکستان کے ایٹمی پروگرام اور کشمیر کے مسئلے پر لیبیائی تائید اس کی مثالیں ہیں۔ مجموعی طور پر دونوں ادوار میں تعلقات کی نوعیت دوستانہ، غیر تصادمی اور اسلامی یکجہتی پر مبنی رہی، البتہ شاہی دور میں یہ تعلقات نسبتاً رسمی اور محدود سطح پر تھے۔

ادریس اور ناصر: دو متضاد قیادتوں کا تقابل

شاہ ادریس اور جمال عبدالناصر کا تقابل جدید عرب سیاست کی دو متضاد راہوں کو ظاہر کرتا ہے۔ ادریس روایت، مذہبی سلسلے السنوسیہ کی روحانی قیادت اور بتدریج اصلاح کے نمائندے تھے؛ ان کی حکمرانی قبائلی توازن اور بزرگ قیادت کے احترام پر کھڑی تھی۔ اس کے برعکس ناصر جدید قوم پرست، میڈیا کی طاقت استعمال کرنے والے اور عوامی جذبات کو متحرک کرنے والے رہنما تھے۔ ادریس کی طاقت خاموش سفارت کاری اور مغرب سے اچھے تعلقات تھے، جبکہ ناصر کی طاقت عوامی مقبولیت اور استعمار مخالف بیان بازی تھی۔

لیبیا پر ان دونوں کے اثرات کا یہ دلچسپ پہلو ہے کہ ناصر نے کبھی لیبیا پر براہ راست حکومت نہیں کی، مگر ان کی فکر نے لیبیائی سیاست کی سمت بدل دی۔ مصری اساتذہ، ریڈیو نشریات اور عرب اتحاد کی تحریکوں نے لیبیا کے شہری نوجوانوں کو شاہی نظام سے بیزار کر دیا۔ اس کے ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ ادریس کے دور میں لیبیا نے مسئلہ فلسطین سمیت عرب مقاصد کی مالی و سفارتی حمایت بھی کی اور مصر سے تعلقات عام طور پر پرامن رہے، کیونکہ ادریس تصادم کے بجائے توازن کے قائل تھے۔ آخر میں نتیجہ یہ نکلا کہ شخصی

بنیادوں پر کھڑی بادشاہت نئی نسل کی توقعات کا بوجھ نہ اٹھا سکی، جبکہ جمہوری اداروں کی غیر موجودگی نے پرامن منتقلی کا کوئی راستہ بھی نہ چھوڑا۔ یہی خلا 1969ء کے انقلاب کی اصل وجہ قرار پاتا ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ کہ شاہ ادریس نے لیبیا کو آزاد ریاست کی بنیاد دی مگر بدلتے ہوئے قوم پرست ماحول سے ہم آہنگ نہ ہو سکے، جبکہ ناصر کی فکر نے لیبیا سمیت پورے عرب خطے کی سیاست بدل دی۔ پاکستان کے ساتھ لیبیا کے تعلقات دونوں ادوار میں دوستانہ رہے جن کی بنیاد مشترکہ مذہب، اسلامی تنظیموں میں تعاون اور ایک دوسرے کے قومی مقاصد کی حمایت تھی۔

سوال نمبر 4: مراکش کے شاہ حسن دوم کے دور کے اہم سیاسی واقعات کا تنقیدی جائزہ لیں۔ اس کی خارجہ پالیسی کی وضاحت کریں (20 نمبر)

تعارف

شاہ حسن دوم نے 1961ء سے 1999ء تک اڑتیس برس مراکش پر حکومت کی۔ یہ وہ عرصہ ہے جس میں مراکش نے آئینی بادشاہت، کثیر الجماعتی نظام اور شدید سیاسی کشمکش —تینوں تجربات ایک ساتھ دیکھے۔ سبز مارچ اور مغربی صحارا کا مسئلہ ان کے دور کی سب سے بڑی شناخت ہے۔ اس جواب میں ان کے دور کے اہم سیاسی واقعات کا تنقیدی جائزہ اور خارجہ پالیسی کی وضاحت پیش کی گئی ہے۔

تخت نشینی اور آئینی ارتقا

حسن دوم نے اقتدار سنبھالتے ہی 1962ء میں ملک کا پہلا تحریری آئین نافذ کیا جس میں مراکش کو آئینی بادشاہت قرار دیا گیا۔ تاہم بادشاہ کے اختیارات وسیع تھے: وہ وزیر اعظم مقرر و معزول کر سکتا تھا، پارلیمنٹ تحلیل کر سکتا تھا اور مذہبی حیثیت "امیر المؤمنین" کے طور پر اسے منفرد مقام حاصل تھا۔ 1965ء میں کاسابلانکا کے فسادات کے بعد انہوں نے پارلیمنٹ معطل کر کے "حالت استثنا" نافذ کی اور براہ راست حکومت کی۔

1970ء اور 1972ء کے آئینوں کے ذریعے بتدریج پارلیمانی نظام بحال ہوا، مگر اصل طاقت محل کے پاس ہی رہی۔ ستر کی دہائی میں فوجی بغاوت کی دو کوششیں — 1971ء کی صخیرات اور 1972ء کی فضائی سازش — ناکام بنائی گئیں، جن کے بعد فوج کی کڑی نگرانی شروع ہوئی اور داخلی سلامتی کے ادارے مضبوط ہوئے۔

سیاسی واقعات اور داخلی چیلنج

حسن دوم کے دور میں حزب استقلال اور حزب اتحادِ قومی جیسی جماعتوں کے ساتھ محل کے تعلقات کشیدہ و خوشگوار ہوتے رہے۔ بائیں بازو کی تحریکوں اور طلبہ یونینوں کو سخت دبای کا سامنا رہا؛ انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے الزامات اس دور پر آج بھی کیے جاتے ہیں، جنہیں مراکش میں "سیاہ سال" کہا جاتا ہے۔ اس کے باوجود حسن دوم نے مرحلہ وار سیاسی گنجائش پیدا کی: 1977ء میں پارلیمانی انتخابات ہوئے اور نوے کی دہائی میں اپوزیشن رہنما عبدالرحمان یوسفی کو وزیر اعظم بنا کر "تبدیلی کی حکومت" کا تجربہ کیا گیا، جسے ان کی سیاسی ذہانت کی مثال سمجھا جاتا ہے۔

معاشی محاذ پر فاسفیٹ کی برآمد، زراعت اور سیاحت کو فروغ ملا، مگر قرضوں، بے روزگاری اور شہر و دیہات کے فرق نے سماجی بے چینی برقرار رکھی۔ 1981ء اور 1984ء کے روٹی فسادات اسی دباؤ کا اظہار تھے۔

سبز مارچ اور مغربی صحارا کا مسئلہ

ان کے دور کا سب سے اہم واقعہ مغربی صحارا کا مسئلہ ہے۔ 1975ء میں عالمی عدالت انصاف کی رائے کے بعد حسن دوم نے تقریباً ساڑھے تین لاکھ شہریوں کا "سبز مارچ" صحاروی علاقے کی طرف روانہ کیا؛ نتیجتاً سپین نے علاقہ چھوڑ دیا اور میڈرڈ معاہدے کے تحت صحارا مراکش اور موریطانیہ کے درمیان تقسیم ہوا۔ پولیساریو محاذ نے اسے قبول نہ کیا اور الجزائر کی حمایت سے جنگ شروع ہو گئی۔

یہ مسئلہ مراکش کی سیاست، فوجی اخراجات اور سفارت کاری پر حاوی رہا۔ دفاعی دیوار کی تعمیر سے مراکش نے علاقے کا بڑا حصہ اپنے کنٹرول میں رکھا، 1991ء میں جنگ بندی ہوئی، مگر رائے شماری کا وعدہ پورا نہ ہو سکا۔ تنقیدی نظر سے سبز مارچ قومی یکجہتی کا شاندار مظاہرہ تھا، لیکن صحارا تنازع مراکش کے وسائل اور الجزائر سے تعلقات پر مستقل بوجھ بھی بنا رہا۔

خارجہ پالیسی کی وضاحت

حسن دوم کی خارجہ پالیسی توازن اور عملیت پسندی پر مبنی تھی۔ ایک طرف مراکش امریکہ اور فرانس سمیت مغرب کا قابل اعتماد حلیف رہا، سرد جنگ میں مغربی کیمپ کے ساتھ کھڑا ہوا اور سرمایہ کاری و امداد حاصل کی؛ دوسری طرف عرب و اسلامی دنیا میں اس نے فعال کردار ادا کیا۔ حسن دوم نے عرب اسرائیل مفاہمت میں ثالث کا کردار ادا کیا: سادات کے دورۂ یروشلم سے پہلے مصری اور اسرائیلی حکام کی خفیہ ملاقاتیں مراکش میں ہوئیں، اور 1986ء میں اسرائیلی وزیر اعظم کا مراکش کا دورہ بھی اسی سلسلے کی کڑی تھا۔ اسلامی دنیا میں مراکش القدس کمیٹی کی صدارت کے ذریعے مسئلہ فلسطین [illegible]، اور افریقی ممالک سے تعلقات بھی فروغ دیے گئے۔ ان کی پالیسی کا خلاصہ یہ تھا کہ مراکش کو مغرب اور مشرق کے درمیان پل بنایا جائے، قومی مفاد کو نظریات پر مقدم رکھا جائے اور صحارا جیسے قومی مسئلے پر بین الاقوامی حمایت برقرار رکھی جائے۔

حسن دوم کی حکمرانی کا اسلوب اور اس کے اثرات

حسن دوم کی حکمرانی کے اسلوب کو سمجھنا ان کے دور کے واقعات کا جائزہ مکمل کرتا ہے۔ وہ بیک وقت مذہبی پیشوا "امیر المؤمنین"، آئینی بادشاہ اور عملاً چیف ایگزیکٹو تھے۔ ان کی حکمت عملی "کنٹرول شدہ گنجائش" کی تھی: سیاسی جماعتوں کو اتنی آزادی دی جاتی کہ نظام پر دباؤ کم ہو، مگر کلیدی فیصلے ہمیشہ محل کے پاس رہے۔ فرانسیسی تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے وہ مغربی سفارت کاری کی زبان بخوبی سمجھتے تھے اور مراکش کو یورپ کے قریب رکھنے میں کامیاب رہے۔

ان کے دور کے اثرات طویل مدتی ہیں۔ ایک طرف بادشاہت کا ادارہ جدید مراکش میں استحکام کی علامت بن کر ابھرا، سیاحت و فاسفیٹ پر مبنی معیشت نے خطے میں مراکش کو نمایاں رکھا اور دارالحکومت رباط سفارتی سرگرمیوں کا مرکز بنا۔ دوسری طرف ان کے دور میں پیدا ہونے والے سوالات — صحارا کی حتمی حیثیت، انسانی حقوق کا ریکارڈ اور نوجوانوں کی بے روزگاری — اگلی قیادت کو ورثے میں ملے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ حسن دوم نے مراکش کو ٹوٹنے سے بچا کر رکھا اور اسے ایک قابل عمل ریاست بنایا، تاہم جمہوری منتقلی کو انہوں نے جان بوجھ کر سست رفتار رکھا۔ مؤرخین ان کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی سفارتی ذہانت کو سراہتے ہیں اور داخلی آزادیوں کی قیمت پر بھی سوال اٹھاتے ہیں — اور یہی دور خاندازہ ان کے دور کی درست تصویر ہے۔

نتیجہ

نتیجتاً حسن دوم کا دور استحکام اور آمرانہ رجحانات کا امتزاج تھا۔ انہوں نے بادشاہت کو جدید آئینی ڈھانچے میں ڈھال کر محفوظ رکھا، سبز مارچ سے قومی مقصد حاصل کیا اور متوازن خارجہ پالیسی سے مراکش کو خطے کا اہم کھلاڑی بنایا۔ دوسری طرف سیاسی آزادیوں کی محدودیت اور صحارا تنازع کی طوالت ان کے دور کی کمزوریاں ہیں۔ 1999ء میں ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے محمد ششم تخت نشین ہوئے۔

سوال نمبر 5: سوڈان کے پہلے پارلیمانی دور کے اہم واقعات کا تنقیدی جائزہ لیں نیز پاکستان کے ساتھ تعلقات واضح کریں (20 نمبر)

تعارف

سوڈان یکم جنوری 1956ء کو برطانیہ اور مصر کی مشترکہ عملداری سے آزاد ہوا۔ آزادی کے بعد کا پہلا دور، 1956ء سے 1958ء تک، پارلیمانی نظام کا تجربہ تھا جو عبداللہ خلیل کی حکومت کے خاتمے اور جنرل ابراہیم عبود کی فوجی مداخلت پر ختم ہوا۔ یہ مختصر دور سوڈان کی بعد کی سیاست کو سمجھنے کی کنجی ہے۔ اس جواب میں ان واقعات کا تنقیدی جائزہ اور پاکستان سے تعلقات واضح کیے گئے ہیں۔

آزادی اور پارلیمانی نظام کا آغاز

آزادی سے قبل اسماعیل الازہری کی قومی یونینسٹ پارٹی نے مصر کے ساتھ اتحاد کا نعرہ لگایا تھا، مگر انتخابات اور سفارتی پیش رفت کے بعد سوڈانی قیادت نے مکمل آزادی کا راستہ اختیار کیا۔ دسمبر 1955ء میں سوڈانی پارلیمنٹ نے آزادی کا اعلان کیا اور عبوری آئین کے تحت اسماعیل الازہری پہلے وزیر اعظم بنے۔ نئی ریاست کو پانچ رکنی سپریم کونسل ریاست کا سربراہ دیا گیا۔

اس عبوری ڈھانچے نے فوری استحکام تو دیا، مگر ملک کے بنیادی سوالات — مستقل آئین کی نوعیت، اسلامی یا سیکولر ریاست، اور جنوبی صوبوں کی حیثیت — مؤخر کر دیے گئے۔ یہی مؤخر شدہ سوالات بعد میں سوڈان کی سیاست کو بحرانوں میں دھکیلتے رہے۔

اہم سیاسی واقعات

جولائی 1956ء میں ازہری حکومت داخلی اختلافات کا شکار ہوئی اور عبداللہ خلیل نے حزب الامہ اور پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی کے اتحاد سے حکومت بنائی۔ ان کے دور میں امریکہ سے امداد کا تنازع بڑا مسئلہ بنا: امریکی "آئزن ہاور نظریے" اور امدادی پروگرام پر حزب اختلاف اور طلبہ حلقوں نے سخت اعتراض کیا کہ یہ نیل وادی کی غیر جانبداری کے خلاف ہے۔ دوسری طرف مصر سے تعلقات حلفا کی سرحدی کشیدگی کی وجہ سے بگڑے۔

جنوبی مسئلہ اس دور کی سب سے خطرناک ناکامی تھی۔ 1955ء میں توریت کے انتخابات سے شروع ہونے والی جنوبی عدم اطمینانی پر پارلیمانی حکومت کوئی وفاقی حل پیش نہ کر سکی۔ کپاس کی معیشت کی ناکامی، قیمتوں میں کمی اور مہنگائی نے عوامی بے چینی بڑھا دی۔ بالآخر نومبر 1958ء میں عبداللہ خلیل نے خود فوج کو اقتدار سونپنے کی راہ ہموار کی اور جنرل عبود نے مارشل لا نافذ کر دیا۔

تنقیدی جائزہ

تنقیدی طور پر پہلے پارلیمانی دور کی ناکامی کی جڑیں فرقہ وارانہ جماعتی نظام میں تھیں۔ سوڈان کی بڑی جماعتیں مذہبی سلسلوں — انصار اور ختمیہ — کی حمایت پر کھڑی تھیں؛ سیاست نظریے کے بجائے شخصی و فرقہ وارانہ وفاداریوں کا کھیل بن گئی۔ حکومتوں کی تیزی سے تبدیلی، آئین سازی میں ناکامی اور سماجی مسائل کی لاپروائی نے پارلیمانی نظام کی ساکھ ختم کر دی۔

تاہم اس دور کی مثبت باتیں بھی ہیں: پرامن انتقال اقتدار کی روایت، آزاد عدلیہ و صحافت، اور سوڈانائزیشن کے ذریعے انتظامیہ کی مقامی منتقلی کامیابی سے ہوئی۔ یہ دور سکھاتا ہے کہ آزادی کے بعد ادارہ سازی اور قومی سوالوں کا بروقت حل نہ ہو تو جمہوریت خود اپنی ناکامی کی بنیاد رکھ لیتی ہے۔ سوڈان میں یہ سبق بعد میں بھی بار بار دہرایا گیا۔

پاکستان کے ساتھ تعلقات

پاکستان اور سوڈان کے تعلقات ابتدا ہی سے مذہبی و ثقافتی رشتے اور باہمی حمایت پر مبنی رہے۔ پاکستان نے سوڈان کی آزادی کو خوش دلی سے تسلیم کیا اور سفارتی تعلقات قائم کیے۔ دونوں مسلمان اکثریتی ممالک اقوام متحدہ میں نو آبادیاتی نظام کے خاتمے اور مسلمان اقوام کے حق خود ارادیت کی حمایت جیسے معاملات پر ہم آواز رہے۔

پارلیمانی دور میں یہ تعلقات اگرچہ تجارتی حجم کے لحاظ سے محدود تھے، مگر سفارتی گرم جوشی نمایاں تھی؛ تعلیمی و مذہبی وفود کا تبادلہ ہوتا رہا اور سوڈانی طلبہ کے لیے پاکستان کے اداروں میں تعلیم کے مواقع موجود تھے۔ بعد کے ادوار میں یہ بنیاد مزید مضبوط ہوئی، خصوصاً اسلامی کانفرنس تنظیم کے قیام کے بعد دونوں ممالک کا تعاون بڑھا۔ مجموعی طور پر ان تعلقات کی نوعیت دوستانہ، غیر جانبدار اور اسلامی اخوت پر مبنی تھی۔

پہلے پارلیمانی دور کے اسباق اور سوڈانی سیاست

سوڈان کے پہلے پارلیمانی دور کا گہرا سبق یہ ہے کہ آزادی مل جانا اور ریاست چلانا دو الگ صلاحیتیں ہیں۔ سوڈانی قیادت نے برطانوی مصری عملداری سے پرامن راستے سے آزادی حاصل کر کے بڑا کارنامہ کیا تھا، مگر آزادی کے بعد کی سیاست میں جماعتیں قومی پروگرام کے بجائے فرقہ وارانہ بنیادوں پر متحرک رہیں۔ الازہری اور عبداللہ خلیل دونوں تجربہ کار سیاستدان تھے، لیکن ان کی حکومتوں کے پاس نہ تو زرعی معیشت کی اصلاح کا جامع منصوبہ تھا اور نہ جنوبی مسئلے کا سیاسی حل۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پارلیمنٹ عوام کی نظر میں محض اقتدار کی کرسی کا کھیل بن گئی۔

یہ بھی قابلِ غور ہے کہ فوج کو اقتدار سونپنے کا عمل خود وزیرِ اعظم کی خاموش رضامندی سے ہوا، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت کے سیاسی طبقے کو بھی جمہوری نظام کی پائیداری پر اعتماد کمزور پڑ چکا تھا۔ بعد کی سوڈانی تاریخ — 1964ء کی اکتوبر بغاوت، 1969ء کا نمیری انقلاب اور 1985ء کی عوامی تحریک — اسی عدم تسلسل کی کڑیاں ہیں۔

دوسری جانب پاکستان اور سوڈان کے تعلقات کی نوعیت اس دور میں اس لیے بھی اہم ہے کہ دونوں نئی مسلم ریاستوں نے باہمی شناخت و حمایت کو اپنی خارجہ پالیسی کا حصہ بنایا؛ سوڈانی طلبہ کی پاکستان میں تعلیم اور دونوں ملکوں کے وفود کے تبادلے نے وہ انسانی رشتے قائم کیے جو سفارتی اتار چڑھاؤ سے بالاتر ثابت ہوئے۔ یوں یہ دور ہمیں سکھاتا ہے کہ آزادی کی حفاظت جمہوری اداروں اور قومی سوالوں کے بروقت حل سے ہوتی ہے۔

سوڈانی جمہوریت کے تجربے سے حاصل ہونے والا سبق

پہلے پارلیمانی دور کے خاتمے کے بعد سوڈان نے یہی چکر بار بار دہرایا: جمہوری دور آتا، جماعتیں فرقہ وارانہ بنیادوں پر لڑتیں، معاشی بحران بڑھتا اور فوج مداخلت کر دیتی۔ اس تکرار کی وجہ یہی تھی کہ پہلے دور کے بنیادی سوالات — آئین کی اسلامی یا وفاقی نوعیت، جنوب کی خود مختاری اور معیشت کی اصلاح — کسی دور میں بھی حتمی طور پر طے نہ ہوئے۔

یوں 1956ء تا 1958ء کا دور سوڈانی سیاست کا وہ آئینہ ہے جس میں بعد کی تمام ناکامیوں کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ طالب علم کے لیے یہ مثال اہم ہے کہ آزادی کے سورج طلوع ہونے کے بعد کا اصل امتحان اداروں کی تعمیر ہوتا ہے، اور جہاں سیاستدان اس امتحان میں کوتاہی کریں وہاں غیر جمہوری قوتیں خلا پر کر لیتی ہیں۔

نتیجہ

خلاصہ یہ کہ سوڈان کا پہلا پارلیمانی دور امید اور ناکامی کا مرکب تھا: آزادی حاصل ہوئی مگر آئین، جنوب کا مسئلہ اور فرقہ وارانہ سیاست کے حل میں ناکامی نے صرف تین برس میں جمہوریت کو فوجی مداخلت کے حوالے کر دیا۔ پاکستان کے ساتھ اس دور کے تعلقات دوستانہ اور اصولی ہم آہنگی پر مبنی تھے، جو آگے چل کر دونوں ممالک کے تعاون کی بنیاد بنے۔

AIOU LIBRARY aioulibrary.com